آفات اور بلائیں کیوں؟

تحریر: فائزہ بتول نقوی *
رہنما: ڈاکٹر شیخ محمد حسنین

Faizanaqvi80@yahoo.com

کلیدی کلمات: آفات ، مصائب، بلائیں، ،شر ، حادثات، قحط، دکھ، حکمت الٰہی ،عدل الٰہی

خلاصہ :

بلا شک ہماری زندگی میں ہزاروں آفات اور بلائیں، حادثات، بیماریاں، قحط وغیرہ پائے جاتے ہیں۔ جنہیں دیکھ کر انسان کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ آخر یہ آفات کیوں؟ یہ سوال اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ ہم مسلمان ہیں اور ہمارا عقیدہ ہے کہ اس کائنات کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ وہ قادرِ مطلق ہے اور اگر ایسا ہے تو اس نے دنیا کو اس طرح کیوں خلق نہیں کر دیا کہ اس میں کوئی آفت، دکھ اور درد نہ ہوتا؟ یہ بحث اس لئے بھی ضروری ہے کیونکہ بعض لوگ اپنی محدود معلومات کی وجہ سے مختلف آفات کو "شر" سے تعبیر کرتے ہوئے اللہ کی حکمت اور عدل کا انکار کرتے ہیں اور آفات کو قدرت الٰہی یا عدلِ الٰہی کے منافی شمار کرتے ہیں۔ آفات کے فلسفہ کو سمجھنا ضروری ہے کیونکہ اگر انسان دنیا میں پائی جانے والی آفات کا فلسفہ نہ جانتا ہو تو اس کے لئے مؤمنانہ زندگی بسر کرنا اور مشکلات کا سامنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اس دنیا میں انسان پر جو آفات نازل ہوتی ہیں، ان کے مختلف اسباب ہیں جن میں دنیا کی محدودیت، مقصد تخلیق کی تکمیل، انسانی آزادی اور اختیار، انسان میں تضرع کی حالت پیدا کرنا۔۔۔ اس مقالے میں آیات وروایات کی روشنی میں ان اسباب پر نظر ڈالی گئی ہے۔

---

*۔ ریسرچ اسکالر، بی۔ ایس۔ جامعۃ المصطفیٰ العالمیہ، نمایندگی پاکستان، اسلام آباد۔

مقدمہ

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہم جس دنیا میں زندگی بسر کر رہے ہیں اس میں ہزاروں آفات پائی جاتی ہیں۔ زلزلے، حادثات، بیماریاں، قحط۔۔۔ غرضیکہ انسان ان آفات میں اس قدر گھرا ہوا ہے کہ وہ ساری زندگی یوں گزارتا ہے کہ بقول شاعر ؏ :

اِک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے۔

اس دنیا کی ماہیت ایسی ہے کہ بقول شہید دستغیبؒ یہاں انسان کو شہد کا ایک گھونٹ حاصل کرنے کے لئے سینکڑوں ڈنگ سہنا پڑتے ہیں۔ اس صورتحال میں یقینا ایک انسان کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ آخر یہ آفات کیوں؟ اور ان آفات میں گھری زندگی کا کیا فائدہ؟ یہ سوال ایک اور لحاظ سے بھی اہم ہے۔ اس لئے کہ ہم مسلمان ہیں اور ہمارا یہ محکم عقیدہ ہے کہ اس کائنات کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے اور اس کی حکمت میں کوئی خدشہ نہیں۔ اور اگر ایسا ہے تو اللہ تعالیٰ نے دنیا کو اس طرح کیوں خلق نہیں کر دیا کہ اس میں آفات نہ ہوتیں اور انسان کو ہر لحہ خون جگر نہ پینا پڑتا۔ آیا اللہ تعالیٰ کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اس دنیا کو کچھ اس طرح خلق کرتا کہ ہم یہ زندگی مکمل آسودگی سے گزار سکتے؟

اس موضوع پر بحث اس لئے بھی ضروری ہے کیونکہ بعض لوگ اپنی محدود معلومات کی وجہ سے مختلف آفات کو "شر" سے تعبیر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی حکمت اور عدل کا انکار کرتے ہیں اور آفات کو عدلِ الٰہی کے منافی شمار کرتے ہیں۔ آفات کے فلسفہ کو سمجھنا اس لئے بھی ضروری ہے کیونکہ اگر انسان دنیا میں پائی جانے والی آفات کا رمز و راز نہ جانتا ہو تو اس کے لئے زندگی بسر کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ انسان کبھی اپنے مقصد خلقت کو نہیں سمجھ سکتا اور نہ ہی کمال تک پہنچ سکتا ہے۔ پس ارتقاء کی منازل طے کرنے کے لئے ہر انسان پر فرض ہے کہ وہ اس مسئلے سے کسی حد تک ضرور آشنا ہو وگرنہ اس کی زندگی اجیرن بن جائے گی۔ اس کے لئے مشکلات اور آفات کا سامنا کرنا دشوار ہو جائے گا اور وہ کبھی بھی صبر کے مفہوم سے آشنا نہ ہو پائے گا۔

آفات اور بلائیں کیوں؟

اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اس دنیا میں انسان پر جو آفات نازل ہوتی ہیں، ان کی مختلف اسباب ہیں۔ ذیل میں ان اسباب میں سے چند عمدہ اسباب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

1. دنیا کی محدودیت

ہم جس عالم میں زندگی گزار رہے ہیں یہ مادی دنیا ہے اور اس کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت تضاد اور نابرابری ہے۔ ہم عام طور پر دنیا کی محدودیّت کو ہی آفت قرار دیتے ہیں۔ ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ پوری زیادہ سے زیادہ دنیاوی سرمایہ اور مال و متاع اس کے قبضہ میں قرار پائے۔ لیکن جب وہ دیکھتا ہے کہ اس کے حصہ میں کم اور دوسروں کے حصہ میں زیادہ قرار پایا ہے تو وہ اسے آفت اور مصیبت قرار دیتا ہے۔ حالانکہ اگر انسان اپنے انسانی اور مالی ، مادی سرمایہ کو دیکھے اور اس کا اپنی ضروریات سے مقائسہ کرے تو بہت سی آفات اسے آفات محسوس نہ ہوں۔ دراصل اس دنیا میں کوئی آفت مطلق (Absolute) آفت نہیں ہے بلکہ تمام آفات اور بلائیں ایک نسبی (Relative) ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ممکن ہے ایک چیز ایک فرد یا معاشرے کی نسبت نعمت اور دوسرے فرد یا دوسرے معاشرے کی نسبت مصیبت ہو۔

جہاں تک دنیا میں پائی جانے والی فطری نابرابریوں کا تعلق ہے تو یہ بھی کسی طور آفت نہیں ہیں۔ بلکہ کائنات اور انسانی معاشرے کا نظم و نسق انہی کے سہارے چل رہا ہے۔ اور خداوند عالم کی تخلیق میں ان کا مقصد انسانیّت کی بھلائی اور نیکی کے سوا کچھ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان پر بھلائی کی طبیعت غالب ہے۔

2. تخلیق کے ہدف کی تکمیل

انسان عالم خلقت کا شاہکار ہے۔ کائنات کی تخلیق کا مقصد انسان کو کرامت کا تاج پہنانا ہے۔ اور دنیاوی آفات و مصائب دراصل اسی ہدف کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ عام طور پر آفت اور بلا کے مفہوم کو امتحان و آزمائش کے مفہوم کے مساوی جانا جاتا ہے۔ یہاں یقینا یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا آخر کیوں انسان کو آزمائش و امتحان سے دوچار کرتا ہے؟ آیا خدا ہمارے ظاہر و باطن سے بخوبی آگاہ نہیں ہے۔ آیا کائنات کا ہر ذرہ اس کے علم میں نہیں ہے؟ اگر ایسا ہے تو خدا ہمارا امتحان لے کر کیا جاننا چاہتا ہے؟

ان سوالات کا جواب یہ ہے کہ امتحان کا مطلب ہمیشہ اور ہر جگہ کسی انسان کی چھپی صلاحیتوں کو کشف کرنا نہیں ہوتا۔ بلکہ جب خداوند تعالیٰ کسی کا امتحان لیتا ہے تو یقینا ایسا نہیں ہے کہ نعوذباللہ اسے کسی شخص کے باطن کا علم نہ تھا اور وہ امتحان کے ذریعے اس کا علم حاصل کرنا چاہتا ہے۔ لہٰذا الٰہی امتحان اور آفات کا فلسفہ

کشفِ حقیقت یا کسی ضرورت وحاجت کا پورا کرنا اور کسی مجہول کو معلوم بنانا نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ اس عالم کے ظاہر و باطن پر محیط ہے۔ جیسا کہ اس کا فرمان ہے:

''وَأَسِرُّوا قَوْلَكُمْ أَوِ اجْهَرُوا بِهِ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ'' (1)

ترجمہ: "اور تم لوگ اپنی باتوں کو چھپاؤ یا ظاہر کرو یقیناً وہ تو سینوں میں موجود رازوں سے خوب واقف ہے۔"

نیز ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''وَإِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُورُهُمْ وَمَا يُعْلِنُونَO وَمَا مِنْ غَائِبَةٍ فِي السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ'' (2)

ترجمہ: "اور جو کچھ ان کے سینوں میں پوشیدہ ہے اور جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں بتحقیق آپ کا پروردگار اسے خوب جانتا ہے۔ اور آسمان اور زمین میں کوئی ایسی پوشیدہ بات نہیں ہے جو کتاب مبین میں نہ ہو۔"

پس امتحان الٰہی کا مقصد افراد کے باطن کا کشف اور ان کی حقیقت کے بارے میں جاننا نہیں بلکہ الٰہی امتحان کا راز، انسان کی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو آشکار کرنا ہے۔ الٰہی امتحان کا اصل فلسفہ انسان کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنا اور انسان کو امتحانات سے گزار کر اسے کمالِ انسانیت تک پہنچانا ہے۔ جس طرح ایک زرگر سونے کو آگ میں ڈال کر کندن بناتا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو امتحانات سے گزار کر خالص بناتا ہے۔ لہٰذا اگر اس تناظر میں دیکھا جائے تو کوئی امتحان، آفت نہیں، بلکہ رحمت ہے۔ کیونکہ خدا حکیم ہے اور اس کی صفت حکمت کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہ ہو۔ اس کی طرف سے اپنے بندوں سے لیے جانے والے امتحانات میں کوئی نہ کوئی حکمت پوشیدہ ہوتی ہے۔ ہاں! یہ الگ بات ہے کہ ضروری نہیں ہر کام میں پوشیدہ الٰہی حکمت کا ہمیں علم ہو اور ہر امر کی علت اور راز ہمیں معلوم ہو۔ اس حوالے سے استاد شہید مرتضیٰ مطہری فرماتے ہیں:

"ایک وقت ہم کسی چیز کی آزمائش کرتے ہیں تاکہ مجہول کو معلوم بنالیں۔ اس کام کے لئے ہم کوئی میزان و مقیاس مقرر کرتے ہیں۔ مثلاً ترازو کے پلڑوں میں کسی چیز کو تول کر ہم اس بات کا

انداز لگاتے ہیں اس چیز کا وزن کتنا ہے لیکن ترازو صرف اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ جسم کا وزن کتنا ہے اس کی کمی یا زیادتی میں ترازو موثر نہیں بلکہ وزن کو کم یا زیادہ کرنے کے لئے ہمیں دوسرا فعل انجام دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح امتحان کے ایک اور معنیٰ ہیں وہ یہ کہ "قوّت" (Potential) کو "فعل" (Actual) کے زمرہ میں لانا اور اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا۔ خدا جو امتحانات اور شدائد کے ذریعہ آمائش کرتا ہے وہ اس معنیٰ میں ہے کہ ان کے ذریعے ہر فرد جس کمال وسعادت کا اہل ہے اس تک اس کو پہنچا دیا جائے۔ فلسفہ شدائد وابتلا صرف وزن کو تولنا اور کمیت کا اندازہ کرنا نہیں ہے، بلکہ وزن کو زیادہ کرنے اور کیفیت کو بلند درجہ پر پہنچانے کا ذریعہ ہے۔" (3)

خلاصہ یہ کہ آفات میں تربیتی اثر پایا جاتا ہے اور یہ فرد یا معاشرہ کی تربیت کا سبب بنتی ہیں اور یوں آفات سے گذر کر انسان اپنی تخلیق کے ہدف تک پہنچتا ہے۔ جس طرح سیاہ رات کا خاتمہ، روشنی ہے، اسی طرح رنج ومصیبت کا اختتام انسان کی سعادت اور خوشبختی پر ہوتا ہے۔ آفات اور بلاؤں کے اسی فلسفہ کی طرف حضرت علی علیہ السلام نے بصرہ کے گورنر عثمان بن حنیف کے نام اپنے خط میں یوں فرمایا ہے:

”ألا وإن الشجرة البرية أصلب عودا، والروائع الخضرة أرق جلودا، والنباتات البدوية أقوى وقودا و أبطأ خمودا“

ترجمہ: ”آگاہ رہو کہ صحرا کے درخت کی لکڑی زیادہ سخت ہوتی ہے۔ اس کے برعکس،۔" (4)

حضرت علی علیہ السلام اولیاء الٰہی کی آزمائش اور ابتداء کے فلسفہ کے بارے میں نہج البلاغہ میں فرماتے ہیں:

"اگر خداوند متعال خانہ خدا اور حج کے مراسم انجام دینے کی جگہوں کو باغوں، لہروں اور سرسبز وادیوں اور گلستانوں میں قرار دیتا تو جس قدر یہ آزمائش سادہ وآسان تھی اجر بھی ہلکا ہوتا جبکہ خداوند متعال اپنے بندوں کو قسم قسم کی سختیوں سے آزماتا ہے اور کافی مشکلات کے ساتھ عبادت کے لئے بلاتا ہے اور انواع اقسام کی گرفتاریوں سے مبتلا کرتا ہے تاکہ تکبر وخود پسندی کو ان کے دلوں میں خارج کرے اور اس کی جگہ پر فروتنی لائے اور فضل ورحمت کے دروازے ان پر کھول دے اور عفو وبخشش کے وسائل کو آسانی کے ساتھ ان کے اختیار میں قرار دے۔" (5)

3. انسانی آزادی اور اختیار

مذکورہ بالا بحث کی روشنی میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ انسانی معاشرے پر طرح طرح کی مصیبتوں، بلاؤں اور آفات کے نازل ہونے میں ایک اہم عنصر انسانی آزادی اور اختیار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک آزاد اور صاحب اختیار مخلوق خلق کیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا'' (6)

ترجمہ: "بے شک ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا ہے کہ اسے آزمائیں۔ پس ہم نے اسے سننے والا، دیکھنے والا بنایا ہے۔ ہم نے اسے راستے کی ہدایت کردی ہے، خواہ شکر گزار بنے، خواہ ناشکرا بنے۔"

لیکن انسان کے آزاد اور صاحبِ اختیار مخلوق خلق ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ہر قید و بند سے آزاد ہے۔ دراصل، اللہ تعالیٰ نے انسان کو آزادی اور اختیار کی نعمت عطا کی ہے تاکہ انسان کو آزمائے اور آزمانے کے لئے ضروری ہے کہ انسان کو آفات و مصائب سے گذارا جائے اور انسان اپنے ارادے اور اختیار سے اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اطاعت کا راستہ اپنائے۔ پس انسان کا یہ اختیار جہاں اسے عمل کی طاقت و قدرت عطا کرتا ہے، وہاں سے مصائب و مشکلات اور آفات و بلائیں جھیلنے کی راہ پر گامزن کرتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں پر خاص مصیبتیں اور بلائیں نازل کرتا ہے جو کافروں پر بھی نازل نہیں ہوتیں۔ اسی لئے تو کہا گیا ہے کہ: ''البلاء للولاء'' یعنی: بلا دوستوں کے لئے ہوتی ہے۔ حضرت امام صادق علیہ السلام سے ایک معتبر روایت میں نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا:

''إِنَّ أَشَدَّ النَّاسِ بَلَاءً الْأَنْبِيَاءُ ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ ثُمَّ الْأَمْثَلُ فَالْأَمْثَلُ''

یعنی: ''سب سے شدید بلائیں انبیاء پر نازل ہوتی ہیں اور جن لوگوں کا مقام و مرتبہ ان کے بعد ہے ان پر ان کے مرتبہ کے مطابق بلائیں نازل ہوتی ہیں۔" (7)

ایک اور روایت میں آیا ہے:

''إِنَّ اللّٰهَ إِذَا أَحَبَّ عَبْداً غَتَّهُ بِالْبَلَاءِ غَتّاً''

ترجمہ: "جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو اسے بلاء میں مبتلا کر دیتا ہے۔" (8)

حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کا فرمان ہے:

"مؤمن کی مثال ترازو کے دو پلڑوں کی سی ہے۔ جس قدر اس کا ایمان بڑھتا جاتا ہے اسی قدر اس کی مصیبت بڑھتی جاتی ہے۔" (9)

پس آفات کے راستے سے گزرنا، ایک مؤمن انسان کے اپنے اختیار کا سودا ہے۔ البتہ یہ سودا گھاٹے کا سودا نہیں بلکہ سراسر ثواب اور منفعت کا سودا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْٓا اَوْ مَاتُوْا لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقًا حَسَـنًا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ لَيُدْخِلَنَّهُمْ مُّدْخَلًا يَّرْضَوْنَهٗ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيْمٌ حَلِيْمٌ" (10)

ترجمہ: "اور جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی اور پھر مارے گئے یا مر گئے انہیں اللہ یقیناً اچھی روزی سے ضرور نوازے گا اور رزق دینے والوں میں یقیناً اللہ ہی بہترین رزق دینے والا ہے۔ وہ ایسی منزل پر انہیں ضرور اتارے گا جسے وہ پسند کریں گے اور اللہ یقیناً بڑا دانا، بڑا بردبار ہے۔"

خلاصہ یہ کہ بلاؤں میں مبتلا ہونے کا ایک فلسفہ انسان کا اپنی آزادی و اختیار سے بلاؤں کو گلے لگانا اور اس کے نتیجے میں خدا کی رضا اور الٰہی اجر و پاداش کا مستحق قرار پانا ہے۔ اس حوالے سے حضرت علی علیہ السلام کا فرمان ہے:

"بڑی بلاؤں کے ساتھ اجر عظیم ہیں اگر خداوند سبحان کسی قوم کو دوست رکھتا ہو تو انہیں آزمائش و بلا سے دوچار کرتا ہے۔ (11)

4. تضرع کی حالت پیدا کرنا

قرآن کئی مقامات پر مصیبتوں اور آفات و بلاؤں کو خشوع و خضوع کا ذریعہ بنایا گیا ہے۔ قرآن کریم سابقہ انبیاء کی امتوں پر نزول بلا کا سبب یہ بیان کرتا ہے کہ وہ سرکش اور باغی ہو گئے تھے اور ان پر مصیبتیں اس لئے نازل ہوئیں کہ وہ بغاوت سے ہاتھ اٹھالیں اور ان کے دل نرم ہو جائیں:

"وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا إِلَى أُمَمٍ مِّن قَبْلِكَ فَأَخَذْنَاهُم بِالْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُونَ" (12)

ترجمہ: ''اور بے شک آپ سے پہلے (بھی) بہت سی قوموں کی طرف ہم نے رسول بھیجے پھر ہم نے انہیں سختیوں اور تکالیف میں مبتلا کیا تاکہ وہ عاجزی کا اظہار کریں۔''

''وَنَادَىٰ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ أَصْحَابَ النَّارِ أَن قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ وَجَدتُّم مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا قَالُوا نَعَمْ فَأَذَّنَ مُؤَذِّنٌ بَيْنَهُمْ أَن لَّعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ'' (13)

ترجمہ: ''اور اہلِ جنت دوزخ والوں کو پکار کر کہیں گے: ہم نے تو واقعتاً اسے سچّا پالیا جو وعدہ ہمارے رب نے ہم سے فرمایا تھا، سو کیا تم نے (بھی) اسے سچّا پایا جو وعدہ تمہارے ربّ نے (تم سے) کیا تھا؟ وہ کہیں گے: ہاں۔ پھر ان کے درمیان ایک آواز دینے والا آواز دے گا کہ ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے۔''

قرآن کریم میں بعض لوگوں کے لئے رزق کی تنگی کو بھی مایۂ برکت قرار دیا گیا ہے اور اسے یادِ خدا اور ظلم و بغاوت اور سرکشی و عصیان سے بچنے کا وسیلہ قرار دیا گیا ہے۔ عام طور پر فقر و فاقہ کو مصیبت اور آفت تصور کیا جاتا ہے لیکن قرآن کریم کی منطق یہ ہے کہ:

''وَلَوْ بَسَطَ اللَّهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهِ لَبَغَوْا فِي الْأَرْضِ وَلَٰكِن يُنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَاءُ إِنَّهُ بِعِبَادِهِ خَبِيرٌ بَصِيرٌ'' (14)

ترجمہ: ''اور اگر اللہ اپنے بندوں کے لیے رزق میں فراوانی کر دیتا تو وہ زمین میں سرکش ہو جاتے لیکن اللہ جو چاہتا ہے وہ ایک مقدار سے نازل کرتا ہے، وہ اپنے بندوں سے خوب باخبر، نگاہ رکھنے والا ہے۔''

خوف، بھوک، اموال اور انفس کا تلف ہونا اور ثمرات کی کمی جیسی تمام ظاہری آفات کو قرآن کریم نے آزمائش کا وسیلہ اور اس پر صبر کو ایک عظیم کامیابی قرار دیتے ہوئے صابرین کو بشارت اور خوشخبری سنانے کی بات کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ چیزیں جنہیں عام طور پر آفت، مصیبت اور بلا تصوّر کیا جاتا ہے، مایۂ شکر، لطف اور کمال ہیں۔ جیساکہ درج ذیل آیہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''وَلَنَبْلُوَنَّكُم بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ'' (15)

ترجمہ: ''اور ہم تمہیں کچھ خوف، بھوک اور جان ومال اور ثمرات (کے نقصانات) سے ضرور آزمائیں گے اور آپ ان صبر کرنے والوں کو خوشخبری سنا دیجئے۔''

5. خواب غفلت سے بیداری

قرآن کریم کی کئی آیات میں انسان پر نازل ہونے والی مصیبتوں اور بلاؤں کا سبب انسان کو خواب غفلت سے بیدار کرنا بتایا گیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّآ اَخَذْنَآ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَاۗءِ وَالضَّرَّاۗءِ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ'' (16)

ترجمہ "اور ہم نے کسی شہر اور آبادی میں کوئی نبی نہیں بھیجا سوائے یہ کہ اس کے رہنے والوں کو سختیوں اور تکلیفوں میں مبتلا کیا تاکہ وہ ہوش میں آئیں اور خدا کی طرف پلٹیں۔"

یہ آیت بعض پیغمبروں کی سرگزشت جیسے حضرت نوحؑ، ہودؑ، صالحؑ، لوطؑ وغیرہ کی سرگزشت کے بیان میں آئی ہے۔ اس میں فرمایا گیا ہے کہ ہم نے کسی شہر میں پیغمبر نہیں بھیجا سوائے یہ کہ وہاں کے لوگوں کو تکلیفوں اور بلاؤں میں گرفتار کیا تاکہ تھوڑا بیدار ہوں۔ اور اپنے طغیان وسرکشی سے ہاتھ اٹھالیں اور اس کی طرف رجوع کریں۔ اور یہ اس لئے تھا کہ انسان کی طبیعت ہے کہ جب تک وہ ناز ونعت میں رہتا ہے اس میں حق قبول کرنے کی صلاحیت کم ہوتی ہے مگر جس وقت وہ گرداب بلا میں گرفتار ہو جاتا ہے اختیار بد کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اس وقت اس کا دل جی نصیحت قبول کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ بعض لوگ کی مشکلات جب برطرف ہوجائیں وہ دوبارہ خواب غفلت میں چلے جاتے ہیں جبکہ بعض کے لئے یہ مشکلات ایک موڑ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان مصائب کے بعد ان کی رفتار و کردار کا رخ بدل جاتا ہے۔

''وَلَقَدْ أَخَذْنَا آلَ فِرْعَونَ بِالسِّنِينَ وَنَقْصٍ مِّن الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُونَ'' (17)

ترجمہ: ''اور بتحقیق ہم نے آل فرعون کو قحط سالی اور پیداوار کی قلّت میں مبتلا کیا شاید وہ نصیحت حاصل کریں۔''

اس آیت میں بھی گمراہوں کے بارے میں گفتگو جاری ہے اور قرآن آفات کو ان کے بیدار کرنے کا ذریعہ قرار دیتا اور ارشاد فرماتا ہے کہ ہم نے سابقہ انبیاء کی امّتوں کو بیدار کرنے اور ان کی تربیت کی خاطر

مشکلات، سخت حوادث، فقر و فاقہ ، خشک سالی، بیماری اور امراض و وباؤں سے دوچار کیا تاکہ خواب غفلت سے بیدار ہوں اور خدا کی طرف پلٹ آئیں۔ کیونکہ غربت اور بیماری کا مزہ چکھے بغیر کوئی بھی تندرستی اور ثروت کی اہمیت کو نہیں سمجھ سکتا۔ اسی طرح جب تک وہ روحانی مشکلات میں گرفتار نہ ہو معنویات کے مفہوم سے ناآشنا رہتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں آفات کا ایک فلسفہ مؤمن انسان کو خواب غفلت سے بیدار کرنا بتایا گیا ہے۔ جیساکہ حضرت امام صادق علیہ السلام سے منقول ایک روایت میں آیا ہے کہ:

''جب خدا کسی بندہ کے لئے خیر کا ارادہ کرتا ہے تو اس کو بلاؤں اور مصیبتوں میں گرفتار کر دیتا ہے تاکہ اس کے ذریعے بندہ استغفار کی جانب متوجہ ہو۔'' (18)

6. آفات کا نزول، انسانی بداعمالیوں کا نتیجہ

اس حقیقت کو بھی سمجھنا چاہیے کہ ہمارے اوپر آنے والی اکثر بلائیں اور مصیبتیں دراصل ہماری اپنی بداعمالیوں کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ قرآن انسان کی سعادت وشقاوت کو خود اس کے اعمال کا عکس العمل اور نتیجہ قرار دیتا ہے۔ بعض مشکلات وآفات مکافات عمل ہوتی ہیں:

''وَمَا أَصَابَكُم مِّن مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُوا عَن كَثِيرٍ'' (19)

ترجمہ: ''اور تم پر جو مصیبت آتی ہے وہ خود تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے آتی ہے اور وہ بہت سی باتوں سے در گزر کرتا ہے۔''

7. اظہارِ حقیقت

قرآنی تعلیمات کی روشنی میں کئی آفات کے نزول کا سبب، انسان کے چھپے باطن کو ظاہر کرنا ہوتا ہے۔ جیسا کہ شیطان کے ساتھ بھی ایسا ہوا۔ ابلیس جس نے سالہاسال خدا کی عبودیت اور بندگی کا ڈھونگ رچایا اور اپنے تکبر کو دوسروں حتی اپنے آپ سے چھپائے رکھا امتحان کے موقع پر اس کی حقیقت آشکار ہو گئی۔ لہٰذا آفت و بلا و مصیبت گمراہی اور ریاکاری کے پردوں کو منافقین کے چہروں سے ہٹا دیتی اور ان کی حقیقت کو عیاں کر دیتی ہیں۔ جیساکہ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

''وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتَّى نَعْلَمَ الْمُجَاهِدِينَ مِنكُمْ وَالصَّابِرِينَ وَنَبْلُوَا أَخْبَارَكُمْ'' (20)

ترجمہ: ''اور ہم تمہیں ضرور آزمائش میں ڈالیں گے یہاں تک کہ ہم تم میں سے جہاد کرنے والوں اور صبر کرنے والوں کی شناخت کر لیں اور تمہارے حالات جانچ لیں۔''

یقیناً یہاں شناخت اور حالات کی جانچ سے مراد یہ نہیں کہ نعوذ باللہ، اللہ تعالیٰ پر ان کا معاملہ مخفی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ پر کچھ مخفی نہیں ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوا ہے:

''قُلْ أَتُعَلِّمُونَ اللهَ بِدِينِكُمْ وَاللهُ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَاللهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ'' (21)

ترجمہ: ''کہہ دیجئے: کیا تم اللہ کو اپنی دینداری کی اطلاع دینا چاہتے ہو؟ جبکہ اللہ تو آسمانوں اور زمین میں موجود ہر چیز سے واقف ہے اور اللہ ہر شے کا خوب علم رکھتا ہے۔''

پس مراد یہ نہیں ہے کہ خدا امتحان کے ذریعے ان لوگوں کی حالت اور کیفیت کو جاننا چاہتا ہے، بلکہ مراد انسانی حقیقت پر پڑے پردوں کو چاک کرنا اور ایک مسلمان انسان کو خواب غفلت سے بیدار کرنے اور اسے آگے بڑھنے کی منزل دکھانا اور تشویق کرنا ہے۔ اس حوالے سے قرآن کریم کی درج ذیل آیت بھی قابل توجہ ہے:

''ثُمَّ أَنزَلَ عَلَيْكُم مِّن بَعْدِ الْغَمِّ أَمَنَةً نُّعَاسًا يَغْشَىٰ طَائِفَةً مِّنكُمْ وَطَائِفَةٌ قَدْ أَهَمَّتْهُمْ أَنفُسُهُمْ يَظُنُّونَ بِاللَّهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ يَقُولُونَ هَل لَّنَا مِنَ الْأَمْرِ مِن شَيْءٍ قُلْ إِنَّ الْأَمْرَ كُلَّهُ لِلَّهِ يُخْفُونَ فِي أَنفُسِهِم مَّا لَا يُبْدُونَ لَكَ يَقُولُونَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هَاهُنَا قُل لَّوْ كُنتُمْ فِي بُيُوتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِينَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ إِلَىٰ مَضَاجِعِهِمْ وَلِيَبْتَلِيَ اللَّهُ مَا فِي صُدُورِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِي قُلُوبِكُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ'' (22)

ترجمہ: ''پھر جب اس غم کے بعد تم پر امن و سکون نازل فرمایا تو تمیں سے ایک گروہ تو اونگھنے لگا، جب کہ دوسرے گروہ کو اپنی جانوں کی پڑی ہوئی تھی، وہ ناحق اللہ پر زمانہ جاہلیت والی بدگمانیاں کررہے تھے، کہہ رہے تھے: کہہ دیجئے: سارا اختیار اللہ کے ہاتھ میں ہے، یہ لوگ جو بات اپنے اندر چھپائے رکھتے ہیں اسے آپ پر ظاہر نہیں کرتے، وہ کہتے ہیں: اگر (قیادت میں) ہمارا کچھ دخل ہوتا تو ہم یہاں مارے نہ جاتے، کہہ دیجئے کہ اگر تم اپنے گھروں میں ہوتے تو بھی جن کے

مقدر میں قتل ہونا لکھا ہے وہ خود اپنے مقتل کی طرف نکل پڑتے اور یہ (جو کچھ ہوا وہ اس لیے تھا) کہ جو کچھ تمہارے سینوں میں ہے اللہ اسے آزمائے اور جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اسے چھانٹ کر واضح کردے اور اللہ دلوں کا حال خوب جانتا ہے۔''

خلاصہ یہ کہ مذکورہ بالا آیت میں جنگ احد میں فتح پانے کے بعد لشکرِ اسلام کے شکست سے دوچار ہونے کا ایک سبب چند مسلمانوں کے ایمان کی کمزوری اور دل میں چھپے ضعف کو بیان کیا گیا ہے جو اس جنگ میں ہزیمت کے بعد آشکار ہوا۔ گویا مصیبت و بلا کا ایک عالیشان فلسفہ اور حکمت قلب کی پاکیزگی اور پلیدگی کا اظہار ہے تاکہ لوگوں پر ان کے اندر کی حقیقت آشکار ہو جائے اور وہ اپنی تربیت اور تہذیب نفس کی طرف بڑھ سکیں۔ (23)

*****

حوالہ جات

1۔ملک/13

2۔ نمل/74،75

3۔ شہید مرتضی مطہری؛ بیست گفتار؛ صفحہ 148،149

4۔ نہج البلاغہ ؛مکتوب : 45۔

5۔ نہج البلاغہ ، ص۳۸۹۔۳۹۱، خطبہ ۱۹۲

6۔انسان/۲-۳

7۔ کلینی،اصول کافی ، ج2، ص253

8۔ایضا؛ 254

9۔ مجلسی، بحارالانوار ،ج 67، ص 243

10۔ حج/۵۹-۵۹

11۔ عبدالواحد بن محمد تمیمی، آمدی، غررالحکم و دررالکلم ج۲، ص

12۔انعام/42

13۔ اعراف/44

14۔ شُوریٰ/27

15۔ بقرہ/155

16۔اعراف/ ۹۴

17۔ اعراف130

18۔ محمدی ری شہری؛ میزان الحکمۃ، جلد۲، صفحہ ۵۷۷

19۔ شوری/30

20۔ محمد/31

21۔ حجرات/16

22۔آل عمران/154

23۔دیکھیے: ناصر مکارم شیرازی؛ تفسیر نمونہ؛ جلد۲، صفحہ ۲۷۹۔